ڈاکٹر سید کامران عباس کاظمی
اسسٹنٹ پروفیسر
شعبہ اردو، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد

مرزا ہادی رسوا کے ناولوں میں تہذیبی شعور

Mirza Hadi Ruswa is one of the most prominent Urdu novelists. He also had the honour of being the first psychological novelist in Urdu. He had written four novels, including Amrao Jan Ada, Sharifzada, Zat-e-Sharif and Akhtari Begum. Lucknow civilization is depicted in Ruswa's novels. The cultural consciousness of Ruswa is very clear. As a novelist, Ruswa has made the subject of all the aspects of Lucknowi society.This article discusses Mirza Hadi Ruswa's cultural awareness in the light of his novels.

ناول ایک ایسا نثری بیانیہ ہے جس میں انسانی تجربات اور رویوں کو واضح کیا جاتا ہے اور حقیقت نگاری اس کی شرط اولین ہے۔ گویا ناول میں زندگی کے بارے میں کوئی حقیقی نظریہ زندگی موجود ہوتا ہے اور ناول میں یہ نظریہ کہانی یا قصہ میں آمیخت ہو کر ظاہر ہوتا ہے۔ ناول کی مروج تعریفات کا جائزہ لیتے ہوئے ڈاکٹر عبدالسلام لکھتے ہیں:

> (ناول کی) تمام تعریفوں کو سامنے رکھنے سے چند باتیں برآمد ہوتی ہیں، ایک یہ کہ ناول کا موضوع انسانی زندگی ہے۔ ناول نگار مختلف انسانوں کے معاملات، ان کے تعلقات، ان کے احساسات، ان کی محبتوں، نفرتوں ان کے رویوں اور ان کے ماحول کو موضوعی یا معروضی انداز میں پیش کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس کی سب سے اہم خصوصیت یہ ہے کہ یہ فکشن ہے۔ فکشن حقیقت کا متضاد نہیں ہے جیسا کہ عام طور پر سمجھا جاتا ہے۔[1]

ناول زندگی کے رائج تصورات یا رویوں میں تبدیلی پیدا کر دیتا ہے یا تبدیلی کی کوشش کرتا ہے۔ گویا ناول نہ صرف اپنے عصر کی علمیات سے اثر پذیر ہوتا ہے بلکہ اثر انداز بھی ہوتا ہے۔ ناول کے منصب اور عصریت کے پہلو سے متعلق شمس الرحمٰن فاروقی لکھتے ہیں:

> ناول۔۔۔ انسان کے علم میں اضافہ کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ یہ اضافہ اس معنی میں نہیں ہوتا کہ (مثلاً) جسے علم ہندسہ میں فیثا غورث کی اشکال (Pythagorian Theorems) نہ آتی ہوں تو کوئی ناول ایسا ہو سکتا ہوگا جو اپنے قاری کو یہ علم سکھا دے۔ ناول ہمارے علم میں اس قسم کا اضافہ کرنے کا دعویدار ہے کہ (مثلاً) ہم اس سے انسان کی صورت حال، یا انسانی روح یا انسانی دماغ میں واقع ہونے والی باتوں کے

بارے میں کچھ روشنی حاصل کر سکتے ہیں۔مثلاً ''گئودان'' (پریم چند) سے ہمیں اعداد وشمار تو نہیں مل سکتے کہ کسی گاؤں میں کتنے انسان مقروض تھے،اوران کا مجموعی قرض کتنا تھا؟لیکن یہ ضرور معلوم ہوسکتا ہے کہ قرض کے بوجھ تلے دبے ہوئے کسانوں کے دل ودماغ پر کیا گزرتی ہوگی،ان کا آپسی تعامل کیسا ہوتا ہوگا وغیرہ۔ یعنی ''گئودان'' کے ذریعہ ہم مقروض کسانوں کی شخصیت کو سمجھ سکتے ہیں۔[۲]

ناول مبصر حیات ہے۔زندگی کے گوناگوں مناظر اور مظاہر،سماجی ماحول کے مسائل،معاشرتی حدود وقیود،تاریخی تناظر،سیاسی وثقافتی اور تمدنی صورتحال کی عکاسی ناول کا موضوع ہوتے ہیں۔یعنی ناول کا مطالعہ محض تفریح طبع کی چیز نہیں بلکہ ناول میں تہذیبی،تاریخی،تمدنی اور نفسیاتی مطالعہ کیا جاتا ہے۔ناول نگار کا مشاہدہ بلکہ نظریہ حیات ناول کی تشکیل میں کلیدی اہمیت رکھتا ہے۔ناول انسانی زندگی کا بھرپور مطالعہ ہوتا ہے۔یعنی ناول محض زندگی کے اہم واقعات کا بیانیہ نہیں بلکہ ناول نگار کے تجربے اور مشاہدے سے اخذ کردہ زندگی کی ایسی حقیقی تصویر کا اظہار ہے جو خارج میں بھی محسوس کی جاسکے اس طرح ناول زندگی کی تصویر محض نہیں رہتا بلکہ تفسیر حیات بن جاتا ہے۔

ناول ہی عصریت کے اظہار کا بہترین نمائندہ ہے۔ناول میں عصریت کے اظہار کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ ناول تاریخ،نفسیات،تمدن،تہذیب اور سیاست ومعاشرت اور فلسفہ ودیگر عمرانی علوم کا بدل ہے لیکن ناول کا پھیلاؤ اتنا وسیع ہے کہ اس میں یہ تمام علوم سما جاتے ہیں۔بلکہ یہ تمام علوم اپنی مخصوص حدود وقیود کے باعث زندگی کے بطون کے بہت سے راز افشا نہیں کر سکتے فقط ادب ایسا ذریعہ ہے اور بالخصوص ناول جو زندگی کی ہمہ رنگی کو پوری جزئیات کے ساتھ پیش کرتا ہے۔

اردو میں ناول نگاری کا آغاز نذیر احمد کے اصلاحی نقطہ نظر سے لکھے گئے ناولوں سے سمجھا جاتا ہے۔نذیر احمد کی اصلاح پسندی دراصل سرسید تحریک کی دین ہے۔اوراس تحریک پر برصغیر کے غیر ملکی حکمرانوں یعنی نوآبادکار کے اثرات کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔برصغیر کی مخصوص صورتحال میں نوآبادکار نے مذہب اور اخلاقی اقدار کی درجہ بندی الگ الگ کردی اور مزید یہ کہ نوآبادکار نے اس امر پر اصرار کیا کہ مقامی افراد یا محکوم افراد کی اخلاقی حالت بہت پست ہے اور وہ فرسودہ اور مصنوعی اقدار سے چمٹے ہوئے ہیں جو دراصل ان کی زندگیوں کے لیے بوجھ ہیں۔اخلاقی اقدار کی اس فرسودگی اور اس کے بوجھ ہونے اور ترقی کے راستے میں رکاوٹ بننے کا پہلا اعلامیہ ادب میں مولوی نذیر احمد کے ذریعے ظاہر ہوا۔ان کے ناول اردو کے ابتدائی ناول ہیں۔وہ ناول نگار سے زیادہ مصلح کا روپ دھار لیتے ہیں۔مذہبی تشکیک پسندی اور اپنی اخلاقی تہذیبی اقدار کی فرسودگی ان کا خاص موضوع ہیں۔نذیر احمد کے ناولوں میں اس عہد کی ذہنی اور جذباتی کشمکش کا خوب اظہار ہوا ہے۔مولوی نذیر احمد کے ناول گو کہ ناول کی مروجہ تعریف پر پورے نہیں اترتے البتہ ایک ایسا قصہ جو ایک خاص مقصدیت کا حامل ہو اور اس میں ماورائی باتوں کے بجائے حقیقت نگاری سے کام لیا گیا ہو وہ نذیر احمد کا قصہ ہوگا اور ناول کی ذیل میں رکھا جاسکے گا۔نذیر احمد کے ان قصوں کو داستان کی آخری اور ناول کی ارتقائی شکل اور ایک ''تمثیلیہ'' کہا جاسکتا ہے البتہ نذیر

احمد کے فن کے دوسرے دور کے قصے ''محصنات'' اور ابن الوقت'' وغیرہ میں ناول کے لوازم زیادہ نکھری صورت میں موجود ہیں۔ البتہ مولوی صاحب کے قصوں یا تمثیلیہ میں زندگی اور اس کی موجودہ شکل، معاشرت اور اس کے جدید احساسات ولوازمات، تہذیب کی بدلتی صورتیں اور تغیر پذیر سماجی صورتحال کی تصویر کشی خوب ہوئی ہے۔

دوسرے اہم ناول نگار رتن ناتھ سرشار ہیں۔ ان کا داستان نما ناول ''فسانہ آزاد'' دراصل نئی اور پرانی تہذیب کے مابین کشمکش کا اظہار یہ ہے۔ سرشار پرانی تہذیب سے قطع تعلق کرنا چاہتے ہیں جو کہ عصری رویہ ہے اور نئی تہذیب کو اپنے مزاج سے ہم آہنگ نہیں پاتے۔ نوآبادکاروں کی تہذیبی ومعاشرتی اقدار انھیں اپنانے میں مشکل پیش آرہی ہے۔ جبکہ اپنی تہذیبی وسماجی اقدار کی لغویت یا عصریت بدلنے سے ان کی بے معنویت انھیں اپنانے سے گریز پر مجبور کرتی ہے۔ اسی طرح عبدالحلیم شرؔر کے تاریخی ناولوں میں ماضی پسندی، تخیل کی آزاد کارفرمائی، مسلم عہد زریں میں آسودگی کی تلاش، مسلمانوں کے جاہ وجلال کی نو دریافت کا عمل اور خود شرؔر کے مزاج کی ہیجان خیزی جیسے رومانوی عناصر کا خوب اظہار ہوا ہے۔ شرؔر مسلمانوں کے روشن ماضی کی بازیافت کے عمل میں سرگرداں ہیں اور اس ماضی کی کچھ تصویریں انھیں لکھنوی دربار میں نظر آتی ہیں اس لیے ان کے رومانی جذبات اس عہد کی تعریف وتوصیف سے اطمینان حاصل کرتے ہیں۔

اردو ناول نگاری کے ارتقائی دور میں جس ناول کو لازوال شہرت نصیب ہوئی اور جس میں پہلی بار ناول کے اجزائے ترکیبی، قصے کی بہتر اور گتھی ہوئی ساخت، رواں دواں اسلوب اور عمدہ کردار نگاری جیسے وصف موجود تھے وہ مرزا ہادی رسوا کے موئے قلم سے تخلیق ہونے والا ناول ''امراؤ جان ادا'' ہے۔ ''امراؤ جان ادا'' کو ناقدین نے پہلا نفسیاتی ناول بھی کہا ہے۔ ۱۸۵۷ء کے حالات نے ہندوستان میں جو تبدیلیاں پیدا کیں انھوں نے یہاں کی سماجی زندگی کو بہت زیادہ متاثر کیا۔ دہلی اور لکھنو کی فضا میں ایک خاص فرق کے باعث لکھنو میں اصلاحی شعور کے حامل ناول نہیں لکھے گئے اور اگر کہیں بین السطور اصلاحی شعور ملتا بھی ہے تو بھی اس پہ تہذیبی شعور حاوی ہے۔ البتہ انیسویں صدی کے آغاز سے کچھ عرصہ قبل ہندوستانی ذہن انفعالی کیفیت سے نکلنے لگتا ہے اور داخلی وخارجی سطح پر حقیقت پسندی سے کام لیا جانے لگتا ہے۔ سیاسی شعور کی بیداری بھی اس عمل کو تیز کر دیتی ہے۔ فرد کی ذہنی کشمکش کے اثرات سماج کی بے چینی میں نظر آنے لگتے ہیں۔ مرزا ہادی رسوا نے بدلتے عصری تقاضوں کو بھانپ لیا اور نئے سماجی شعور کے اظہار کے لیے ناول کی صنف کو اختیار کیا۔ رسوا کا ذہن بنیادی طور پر سائنسی انداز فکر کا حامل تھا، وہ جدید علوم سے آگاہ تھے۔ اس لیے حالات کا تجزیہ کرتے ہوئے وہ فرد کے ذریعے سماجی صورتحال تک پہنچتے ہیں اور تہذیبی زوال کی صورت گری پورے تہذیبی وعصری شعور سے کرتے ہیں۔ رسوا بطور صنف ادب ناول کے بارے میں ایک مخصوص رائے رکھتے ہیں۔ مرزا ہادی رسوا تخیلی قوت کو سیر بیں قرار دیتے ہیں کہ یہ قوت گذشتہ اور آئندہ کے حالات کو زندہ حقیقت کے طور پر پیش کر دیتی ہے۔ تخیل کی اس عملی کیفیت کے بیان کے بعد وہ ناول کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

ناول ایک ایسی عمدہ چیز ہے جس کے ذریعے سے ہم وہی نقشے (جو اپنی آنکھوں سے دیکھ چکے ہیں) دوسروں کو دکھا سکتے ہیں۔ دنیا میں سب سے مفید اور دلچسپ انسان کے نہ صرف ظاہر حالات بلکہ اس کی باطنی اور بعید از نظر کیفیتیں اس کے ذریعے سے دکھائی جا سکتی ہیں۔ بشرطیکہ واقعات کی ہو بہو تصویریں کھینچنے کی کوشش کی جائے۔ یہ بھی کچھ ضروری نہیں کہ ہم ناول نویسی کے لیے ایسے اشخاص کی سوانح عمری کی تفتیش کریں جن کے مفصل حالات ہم نہیں معلوم کر سکتے۔ خود ہمارے عزیزوں اور دوستوں میں ایسے لوگ ہیں جن کے حالات دراصل بہت ہی عجیب وغریب ہیں مگر ان کے سننے کی ہمیں پرواہ ہی نہیں کیونکہ ہمیں سکندر اعظم، محمود غزنوی، ہنری ہشتم، ملکہ این، نپولین بوناپارٹ کی تاریخوں کے ضخیم مجلدات سے فراغت ہی نہیں ملتی۔[۳]

گویا مرزا رسوا ناول کے لیے جن عناصر کو لازمی سمجھتے ہیں ان میں فنکارانہ شعور کی حامل قوت مشاہدہ، انسانی زندگی کے حالات وواقعات اور کرداروں کی خارجی و باطنی تصویر کشی وغیرہ شامل ہیں۔ اسی طرح وہ ناول کو کسی گم گشتہ عہد کی تاریخ کے بجائے اپنے عہد کی تاریخ بنانا چاہتے ہیں۔ اس سے ان کے تاریخی شعور کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔ ''امراؤ جان ادا'' ناول کی بنیاد بھی زندگی اور موجود ماحول پر ہے۔ غدر کے ابتدائی حالات سے لے کر انیسویں صدی کے آخر تک کے لکھنو کی جھلکیاں اس ناول میں موجود ہیں۔ ''غدر'' سے قبل کا لکھنو اپنی پوری تہذیبی عصریت کے ساتھ نظر نہیں آتا البتہ غدر اور ''غدر'' کے بعد کی عصریت کا اظہار مرزا رسوا نے خوب کیا۔ لکھنو کی تہذیبی وثقافتی قدریں ۱۸۵۷ء کے بعد بھی باقی تھیں۔ اقتدار کی تبدیلی سے گو کہ سماجی قدریں بدل رہی تھیں لیکن ثقافتی وتہذیبی قدریں کسی نہ کسی صورت میں ابھی موجود تھیں۔ ''امراؤ جان ادا'' کے موضوع کی وضاحت کرتے ہوئے ڈاکٹر خورشید الاسلام لکھتے ہیں:

امراؤ جان کا موضوع زوال ہے۔ یہ زوال ایک خاص معاشرت کا ہے، جو اودھ کے چند شہروں میں محدود تھی۔ رسوا اس معاشرت کی تصویر دکھانا چاہتے تھے، ان کے ذہن میں اس کا ایک تصور بھی تھا۔ ان کے چاروں طرف اس کا مواد بکھرا ہوا تھا اور یہ مواد آسانی سے گرفت میں لانا محال تھا۔ ان میں اتنی قوت بھی نہ تھی کہ اسے براہ راست استعمال کر سکیں اور جہاں سے چاہیں بنتے چلے جائیں۔ سرشار کی طرح ان میں یہ حوصلہ نہ تھا کہ وہ ناممکن کو ممکن اور ممکن کو قطعی ثابت کر دکھائیں۔[۴]

سرشار اور سجاد حسین کا موضوع بھی لکھنوی معاشرت ہے اور لکھنو کی زندہ تصویریں انھوں نے بھی دکھائی ہیں لیکن توازن اور ربط کے ساتھ واقعات کی منطقی ترتیب ان کے ہاں ناپید ہے۔ جبکہ رسوا لکھنوی معاشرت کی عکاسی پورے فنی شعور کے ساتھ کرتے ہیں۔ کسی ایک کردار کے گرد واقعات کا جال بن دینے کے بجائے رسوا اس کردار کے ذریعے معاشرت کی عکاسی کرتے ہیں۔ رسوا زندگی میں سنجیدگی اور مزاح کے توازن سے آگاہ ہیں۔ لکھنوی معاشرت سے قاری کو آگاہی ناول کے آغاز میں ہی مل جاتی ہے اور بعد ازاں یہ فضا ناول میں گہری ہوتی جاتی ہے۔ مصنف نے ناول میں دکھایا

ہے کہ لکھنو سے باہر کی فضا مثلاً کانپور کا احوال وغیرہ بھی لکھنو کی مخصوص فضا کی گرد کو نہیں پہنچ سکتے۔ لکھنو کی مخصوص تہذیبی فضا میں عورت کو اہمیت حاصل ہے۔ بلکہ درست معنوں میں طوائف اس تہذیب و معاشرت کا لازمی جزو ہے اور امراؤ جان ادا میں لکھنوی معاشرت اور سماج کی تصویریں امراؤ جان کے ذریعے ہی مصنف نے دکھائی ہیں۔ لیکن مادی اقدار کے فروغ نے عصریت کے معیار بدل دیے۔ جو سماج پہلے طوائف کو معاشرتی ضرورت کے باعث اہم گردانتا تھا وہ اب اسے اخلاقی گراوٹ سمجھنے لگا تھا۔ جبکہ قبل ازیں جنسی آسودگی کے علاوہ سماج کی ضرورت کے اعتبار سے ان بالا خانوں کے مختلف معیار اور مدراج بھی مقرر تھے اور یہ بالا خانے تہذیب و ادب کا معیار سمجھے جاتے تھے۔ البتہ ۱۸۵۷ء کے بعد کی صورتحال نے اس کیفیت کو بدل دیا۔ عظیم الشان صدیقی آنے والی اس تبدیلی کی لہر کا احاطہ یوں کرتے ہیں:

> انیسویں صدی کے آخر میں طوائف کا وہ منصب اور درجہ باقی نہیں رہتا وہ تغیر زمانہ کے باعث اپنے معیار سے گر جاتی ہے۔ لوگ اسے ناپسندیدگی کی نگاہ سے دیکھنے لگتے ہیں اور سماج اسے قبول کرنے کو تیار نہیں ہوتا۔ انسانی ذہن اور سماج کی یہ تبدیلی کسی وقتی جذبہ یا اتفاقی امر کا نتیجہ نہیں ہوتی بلکہ مختلف عوامل و عناصر سے مل کر ترکیب پاتی ہے اور ان کی تلاش و تحقیق ہی حال کو سمجھنے اور مستقبل کی راہیں متعین کرنے میں مدد دیتی ہے اس لیے طوائف کا مطالعہ ہی اس عہد کے فرد و سماج کا حقیقی مطالعہ ہو سکتا ہے۔ اس لیے رسوا اپنے ناول کے لیے اس موضوع کا انتخاب کرتے ہیں جو ان کی حقیقت پسندی کی دلیل ہے اور اس اعتبار سے وہ پریم چند سے قبل ناول نگاروں میں سب سے بڑے حقیقت پسند ہیں۔ [۵]

دراصل اس ناول میں محض طوائف کی داستان نہیں بلکہ رسوا طوائف کے ذریعے نواب واجد علی شاہ اور ۱۸۵۷ء کے بعد کی لکھنوی معاشرت کو پیش کرتے ہیں۔ رسوا اس پوری تہذیب کا نقشہ اختصار کے ساتھ پیش کرنا چاہتے ہیں ویسے بھی اس تہذیب کا طویل بیانیہ سرشار لکھ چکے تھے۔ رسوا کا تہذیبی و سماجی شعور طوائف کے کوٹھے کا انتخاب اس لیے کرتا ہے کہ یہاں سے وہ اس معاشرتی و تہذیبی انفعالیت کے ہر گوشے کو بخوبی دکھا سکتے تھے جو لکھنوی تہذیب کو گھیرے ہوئے تھی اور اہل لکھنو یہ شعور رکھنے کے باوجود عملاً صورتحال کو بدلنے سے عاری تھے۔ شاید اسی لیے ''امراؤ جان ادا'' پورے ناول پر حزن کی ایک خاص فضا طاری رہتی ہے۔ غیر مقصدیت، انفعالیت اور حقیقت سے فرار اس عہد کے لکھنو کی عصریت ہے۔ رسوا کسی خاص فلسفہء حیات کو اختیار کر کے ''امراؤ جان ادا'' نہیں لکھ رہے تھے اور نہ ہی وہ کوئی اصلاحی جذبہ دکھانا چاہتے تھے۔ اس کی وضاحت صغیر احمد صدیقی ان الفاظ میں کرتے ہیں:

> ۔۔۔اس میں درس اخلاق بھی نہیں، اول تو مرزا رسوا کی ذہنیت بھی کسی قسم کے پند و موعظت کے منافی تھی۔ دوسرے یہ ناول ایک محدود طبقہ اور ایک مخصوص زمانہ سے متعلق ہے۔ اگر اس سے استفادہ کر سکتے ہیں تو وہی لوگ جو اس طبقہ سے متعلق ہیں اور باوجود زمانے کی پے در پے ترقیوں کے جو علمی، اخلاقی، سیاسی اور

معاشرتی انقلابات کی صورت میں رونما ہوئی ہیں ہنوز اسی زمانے کی پست اور رکیک طرز معاشرت کے رسوم و قیود میں مبتلا ہیں۔[۶]

البتہ یہ بات ذہن نشین رہے کہ مقصدیت نہ ہونے کا مطلب نذیر احمد کی طرح پہلے مقصدیت طے کرنا اور پھر ناول لکھنا نہیں ہے۔ رسوا زندگی سے متعلق ایک نظریہ ضرور رکھتے ہیں اور ان کا نظریہ حیات ان کے ناولوں سے جھلکتا بھی ہے۔ لیکن وہ نظریہ حیات کے بالواسطہ اظہار کے باوجود انصاف کو ملحوظ رکھتے ہیں اور سماج کے تاریک گوشوں کو بھی پیش کرتے ہوئے کراہت کا تاثر پیدا نہیں کرتے اور نہ ہی تعصب سے کام لیتے ہیں۔ رسوا کے نظریہ حیات کی ایک جھلک دیکھیے:

رسوا: امراؤ جان! میری زندگی کا ایک اصول ہے۔ نیک بخت عورت کو میں اپنی ماں بہن کے برابر سمجھتا ہوں خواہ وہ کسی قوم وملت کی کیوں نہ ہو اور ایسی حرکتوں سے مجھے سخت صدمہ پہنچتا ہے جو اس کی پارسائی میں خلل انداز ہوں۔ جو لوگ اس کو ورغلانے یا بدکار بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ میری رائے میں قابل گولی مار دینے کے ہیں مگر فیاض عورتوں کے فیض سے مستفید ہونا میرے نزدیک کوئی گناہ نہیں۔[۷]

منٹو کے افسانوں کا ایک کردار ''گوپی ناتھ'' اور منٹو کا دوست ''رفیق غزنوی'' دونوں یہاں بیک وقت یاد آتے ہیں۔ البتہ رسوا کا یہی نظریہ حیات ''ذات شریف'' اور پھر ''شریف زادہ'' میں مکمل صراحت کے ساتھ آتا ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ مذکورہ دونوں قصے ناول نہیں بن پائے بلکہ محض لکھنوئی تہذیب کا کھلونا معلوم ہوتے ہیں۔ رسوا نے لکھنو کے زوال کی عکاسی کرتے ہوئے خانم کے کوٹھے اور امراؤ جان طوائف کو مرکزیت دی ہے۔ لکھنو کی اشرافیہ سے متعلق تمام کردار خانم کے کوٹھے کی سیڑھیاں چڑھ کے آتے ہیں اور اپنے اپنے طبقات کا تعارف کراتے ہیں۔ رسوا ان کرداروں کے باطن میں اتر کر اس عہد کے فرد اور سماج کے مابین کشمکش اور انتشار کو اپنے نفسیاتی شعور کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔ بقول ڈاکٹر یوسف سرمست:

اس ناول میں انسانی زندگی کی تاریخ اور رومانوی پہلو کا ایسا نپا تلا امتزاج ہے جو کسی بھی دوسرے ناولوں میں نظر نہیں آتا۔ انھوں (رسوا) نے معاشرت کی عکاسی تک اپنے آپ کو محدود نہیں کر لیا اور دوسرے کرداروں کے احساسات اور جذبات کو بھی پوری طرح پیش کیا ہے۔[۸]

''امراؤ جان ادا'' کے حوالے سے یہ بات اہم ہے کہ آخر رسوا نے لکھنوی تہذیب و معاشرت کی عکاسی خانم کے کوٹھے سے کیوں کی ہے؟ جیسا کہ ڈاکٹر عبدالسلام کا خیال ہے:

لکھنو کی زوال آمادہ تہذیب اور اس زوال کے محرکات کو پیش کرنے کے لیے ڈیرہ دار طوائف سے بہتر کوئی اور ذریعہ نہیں ہو سکتا تھا۔ امراؤ جان جیسی نستعلیق طوائف کا انتخاب ان کی فن کاری اور چابکدستی کا ثبوت ہے۔ اس مقصد کے لیے نہ تو نوابوں کے محل موزوں تھے اور نہ غریبوں کے جھونپڑے۔ دونوں زندگی کا

صرف ایک ہی رخ پیش کرتے ہیں۔طوائف ان تضادات کے درمیان ایک رابطہ تھی۔اس کے کوٹھے پر ہر قسم کے لوگ درس لینے اور دینے آتے ہیں۔گھر پھونک تماشا دیکھنے والے۔طوائفوں کو آلہ کار بنا کر خود آلہ کار بن جانے والے۔۔۔یہاں ہر قسم کے لوگ مل جاتے ہیں۔[۸۶]

گویا رسوا کا سماجی و تہذیبی شعور لکھنوی زوال پذیر تہذیب کو امراؤ طوائف کی آنکھ سے دیکھ رہا ہے۔لیکن سہیل بخاری کو اس پہلو سے اختلاف ہے۔کیونکہ درج بالا اقتباس سے یہ گمان بھی ہوتا ہے کہ لکھنوی معاشرت کے تمام طبقے گویا تماش بین ہو چکے تھے اور محض یہی بات اس تمدن کی اخلاقی گراوٹ کا سبب تھی۔کوٹھے پر جانے والے افراد کا تعلق مختلف طبقات سے ضرور تھا لیکن وہ اپنے طبقات کے نمائندہ ہرگز نہ تھے۔بقول سہیل بخاری:

ان کا انتخاب ناول نگار نے صرف اس مقصد کے لیے کیا ہے کہ ناول میں کرداری تنوع پیدا ہو جائے۔۔۔ جس طرح سرشار کے ناولوں کی مخصوص زندگی کو لکھنو کی مکمل معاشرت پر منطبق نہیں کیا جا سکتا اسی طرح امراؤ جان ادا کی معاشرت کو لکھنوی باشندوں کی مکمل معاشرت قرار نہیں دیا جا سکتا۔مرزا رسوا نے اپنے ناول سے لکھنو کی صرف رنڈی بازی پر روشنی ڈالی ہے،لکھنوی زندگی کے دوسرے پہلوؤں سے سروکار نہیں رکھا۔[۹]

ڈاکٹر بخاری کے اس بیان سے اگر اتفاق کر بھی لیا جائے تو بھی یہ امر قابل غور ہے کہ لکھنو کے اس سماج کی عصریت کا رنڈی یا طوائف لازمہ ہے۔ناول نگار اس کا اظہار امراؤ کی زبان سے بھی کراتا ہے:

آپ کہیئے گا۔اس عمر اور ایسی حالت میں رنڈی نوکر رکھنا کیا ضرور تھا۔

سنیئے مرزا صاحب! اس زمانے کا فیشن یہی تھا کوئی امیر ایسا بھی ہوگا جس کے پاس رنڈی نہ ہو۔نواب صاحب کی سرکار میں جہاں اور سامان شان و شوکت کے تھے وہاں سلامتی منانے کے لیے جلوسیوں میں ایک رنڈی کا بھی اسم،پچھتر روپیہ ماہوار ملتے تھے۔[۱۰]

رسوا اس ناول میں ۱۸۵۷ء کے بعد کے عصر کی نقاشی خوبی سے کرتے ہیں۔نوآبادکاروں کے اختیار کردہ سیاسی نظام نے ایسے طبقے کو بڑھاوا دیا تھا جو اپنے سے بہتر مادی حالات رکھنے والوں کا خدمت گذار ہے اور کم تر کا استحصال کرنے میں دریغ نہیں کرتا۔یہ طبقہ مصلحت اور مفاہمت پسند ہے اور موقع شناس بھی ہے کہ بظاہر صلح پسند ہے مگر قانون اور اقتدار کی پناہ لے کر اپنے مفادات کے حصول کو ترجیح دیتا ہے۔جبکہ ابھی ایسے نواب موجود ہیں جو اس تہذیب کے خالق بھی تھے اور اس کا حصہ بھی تھے لیکن عملاً ہر طرح کے طبقات انفعالیت کا شکار ہیں۔ان کی یہ انفعالیت انھیں جنسی تلذذ کے فریب کا اسیر کر دیتی ہے۔گویا وہ مغرب سے آنے والی تبدیلی کا ساتھ نہیں دے پا رہے اور عمل کی قوت سے محروم ہیں سو محض تماشا اور تماشائی بن گئے ہیں۔یہ تہذیب قوت عمل سے محروم ہوگئی ہے،گو اس میں ابھی کچھ شخصی اوصاف موجود ہیں۔ناول میں ہر طبقہ،سماج اور ہر قسم کے کردار ہیں اور رسوا کی حقیقت پسند آنکھ ان کرداروں کی خوبیوں پر بھی مرکوز رہتی ہے۔یعنی قوت عمل

سے محروم اور حالات کا سامنا نہ کر سکنے والے نوابین میں بھی کچھ شخصی اوصاف موجود ہیں اور رسوا کا سماجی شعور ان کا بخوبی احاطہ کرتا ہے۔ بقول ڈاکٹر خورشید الاسلام:

> رسوا کی قابل ذکر خصوصیت یہ ہے کہ وہ اپنے کرداروں کی بنیادی خصوصیات کو ابھارنے پر اپنی پوری توجہ صرف کرتے ہیں اور ان کی دوسری خصوصیات کو صرف اتنی ہی اہمیت دیتے ہیں جتنی انھیں ایک پیچیدہ کل میں، یعنی کردار کی شخصیت اور ماحول کی تصویر میں حاصل ہونی چاہیے۔ اس طرح کردار کی بنیادی خصوصیات اس کی دوسری خوبیوں اور خامیوں سے مل کر اس میں اور اس کے طبقے اور ماحول میں ایک سچا تناسب اور واضح تعلق قائم کر دیتی ہیں۔ رسوا کا یہ وصف دراصل ان کے سماجی شعور سے پیدا ہوتا ہے۔[11]

رسوا ان اسباب کو بھی زیر بحث لاتے ہیں جو لکھنوی تہذیب کے زوال کا باعث ہیں۔ مثلاً کسانوں پر اتنے لگان لگا دیے جاتے ہیں کہ ان کے گھر اور کھیت نیلام ہونے لگتے ہیں۔ یا پھر وہ ایسی فصلیں کاشت کرنے پر مجبور کر دیئے گئے ہیں جو نوآبادکاروں کے آبائی وطن کی ضرورت ہیں۔ گویا ہندوستان صرف سامراج کے لیے خام مال کی پیداوار کا ذریعہ بن گیا اور تجارتی منڈی کی حیثیت اختیار کر گیا اور اس بات کا شعور ہادی رسوا بخوبی رکھتے ہیں۔ ''امراؤ جان ادا'' کے علاوہ رسوا کے دو اور ناول ایسے ہیں جن میں رسوا کی تخلیقی قوت اور فنی شعور کا احسن اظہار تو نہ ہوا لیکن ان کی مثالیت پسندی کے اظہار کے طور پر انھیں یاد رکھا جائے گا۔ ان میں ایک ''ذات شریف'' اور دوسرا ''شریف زادہ'' ہے۔ سماجی تبدیلی کا ادراک رسوا نے ''امراؤ جان ادا'' میں ہی کر لیا تھا۔ سرسید تحریک سے متاثر ہونے کے باعث جب وہ ''امراؤ جان ادا'' میں ایک موقع پر شاعری کے مزاج میں تبدیلی کی بات کرتے ہیں تو دراصل وہ نئے شعور کی ترویج کا ساتھ دے رہے ہوتے ہیں۔ ''امراؤ جان ادا'' کے ایک مشاعرے میں مظہر الحق نامی شاعر کے ذریعے دراصل رسوا موجود شعری روایت پر طنز کرتے ہیں اور غزل کی تہذیبی روایت میں نظم کا اضافہ کرتے ہیں۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ رسوا انجمن پنجاب کے پیدا کردہ نئے رنگ سخن سے آگاہ ہیں کیونکہ خود نظم کا موضوع واضح شعری تبدیلی کی خبر دے رہا ہے۔ ''شریف زادہ'' میں شعری ہیئت اور موضوعات میں تبدیلی کی خواہش میں رسوا، حالی سے بھی بڑھ جاتے ہیں جب ''عابد حسین'' شاعری میں تبدیلی کے بجائے اسے ترک کر کے دیگر سودمند پیشے اپنانے کی بات کرتے ہیں۔

مرزا رسوا کے دیگر دونوں ناول ''ذات شریف'' اور ''شریف زادہ'' فنی اور موضوعاتی اعتبار سے ''امراؤ جان ادا'' کے قریب بھی نہیں پہنچتے۔ مذکورہ دونوں ناولوں کے موضوعات کے بارے میں ڈاکٹر ظہیر فتح پوری کا خیال ہے:

> ''ذات شریف'' کے دیباچے سے ظاہر ہوتا ہے کہ مرزا کو ان دونوں ناولوں کو لکھنے کا خیال بیک وقت آیا۔ ''ذات شریف'' میں انہوں نے جہالت، بے عقلی اور بے عملی کی بدولت ایک رئیس خاندان کے تباہی دکھلائی اور ''شریف زادہ'' میں ایک غریب نوجوان کو علم، عقل اور عمل کی بدولت ترقی کی منزلوں کو طے کرتے ہوئے

دکھلایا۔ دونوں ناول ۱۹۰۰ء میں شائع ہوئے۔ ''شریف زادہ'' اس لیے زیادہ مقبول ہوا کہ اس میں ایک مثالی انسان کا نمونہ پیش کیا گیا تھا۔[۱۲]

''ذات شریف'' دراصل ایک نوعمر نواب کی کہانی ہے جو اپنی جہالت، کم علمی اور ناتجربہ کاری کے باعث فطری زوال کا شکار ہو جاتا ہے۔ یہ اس عہد کے لکھنو کا عام المیہ تھا۔ دھوکہ بازی اور خوشامد نے اس سماج میں ذریعہ معاش کی شکل اختیار کر لی تھی۔ عظیم الشان صدیقی اس ناول کے پس منظر میں لکھنو کی عصریت کو یوں دیکھتے ہیں:

اس کے پس منظر میں وہ لکھنوی تہذیب و معاشرت کے مختلف پہلوؤں تعیش پسندی، ملا، سیانوں کی، عیار ماماؤں کی سازشوں، جعلیوں کی کارستانیوں، طلسم سازیوں، خوشامدیوں کی خودغرضیوں وغیرہ کے نہایت جیتے جاگتے مرقعے پیش کرتے ہیں۔[۱۳]

ان دونوں ناولوں میں رسوا کی مثالیت پسندی واضح ہے۔ ''امراؤ جان ادا'' میں رسوا نے جس لکھنوی تہذیب کو زوال پذیر دکھایا تھا ان کے ناول ''ذات شریف'' میں وہ زوال مکمل ہو جاتا ہے یعنی اس تہذیب کو اپنے فطری انجام 'موت' سے ہم کنار دکھا کر وہ زوال کی تکمیلی شکل کو ابھارتے ہیں۔ رسوا کے ناولوں میں کرداری ارتقا تو مفقود ہے مگر وہ موضوعاتی ارتقا کا شعور رکھتے ہیں۔ مثلاً اس ناول میں ''امراؤ جان ادا'' کے عصر کے بعد کی صورتحال ہے، جس میں زوال اپنی آخری حدوں پہ پہنچ جاتا ہے اور تبدیلی کی خواہش یہیں سے بیدار ہوتی۔ بقول عبدالاسلام خورشید:

امراؤ جان میں ہم پرانے سماج کے ناخداؤں کو دیکھتے اور اس نتیجے پر پہنچ جاتے ہیں کہ ان میں زندگی کی کوئی قوت باقی نہیں۔ غدر میں یہ صبح کے چراغ کی مانند بھڑکتے اور بجھ جاتے ہیں۔ لیکن غدر کے بعد بھی ان کے باقیات ہندوستان کے ہر کونے میں دکھائی دیتے ہیں۔ جنھیں دیکھ کر ہمارے دل میں قدرتی طور یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اب ان کا انجام کیا ہوگا؟ آیا ان میں اپنے آپ کو بدلنے اور زندگی سے آنکھیں ملانے کی کوئی امنگ بیدار ہوتی ہے، ہوسکتی ہے یا نہیں؟ اس کا جواب ہمیں رسوا کے دوسرے ناول ''ذات شریف'' میں ملتا ہے۔[۱۴]

یہ دراصل لکھنو کے امیروں کا فسانہ ہے اور ۱۸۵۷ء کے بعد کے لکھنو کا احوال ہے۔ پرانے خیالات ابھی دماغوں میں راسخ ہیں جو جدید علوم کو ماننے پہ تیار نہیں۔ ''ذات شریف'' میں موجودہ لکھنو میں قدیم اور جدید خیالات میں تصادم نظر آتا ہے۔ ''ذات شریف'' اور عصریت کے حوالے سے ڈاکٹر توحید خاں کی رائے سے صرف نظر نہیں کیا جا سکتا۔ وہ لکھتے ہیں:

''ذات شریف'' میں رسوا نے لکھنو کے بیمار اور انتشار پذیر سماج کا نقشہ کھینچا ہے اور ان عیوب اور کمزوریوں کی نشان دہی کی ہے جو اس عظیم الشان تہذیب کی تباہی کا باعث بنیں۔ گویا لکھنو کی مٹتی ہوئی سماجی قدریں اور

نوابین کے لٹے ہوئے طبقے کی ذہنی، معاشی، اخلاقی اور سماجی پستی ''ذات شریف'' کا موضوع ہے۔[۱۵]

گویا ایک بے مقصد زندگی ہے جو یہ امیر طبقہ گذار رہا ہے۔ سکول کالج کھل جانے اور وسائل کی بہتات کے باوجود امرا کا یہ طبقہ علم حاصل کرنے کو غیر ضروری سمجھتا ہے۔ گویا اب اس میں زندگی سے وابستہ رہنے کی صلاحیت مفقود ہو چکی ہے۔ ''ذات شریف'' کے علاوہ مرزا رسوا کا ایک اور ناول ''شریف زادہ'' بھی ان کی مثالیت پسندی کا نمائندہ ہے۔ خود یہ ناول لکھنے کا مقصد مرزا رسوا نے ایک مثالی (Ideal) انسان کا کردار پیش کرنا لکھا ہے۔ چنانچہ وہ ''شریف زادہ'' کے دیباچہ میں لکھتے ہیں:

> ممکن ہے کہ ایک شریف زادہ کی لائف کا آئیڈیل بعینہ وہی نہ ہو جو کہ مرزا عابد حسین ہے لیکن اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ ضرورت زمانہ کو دیکھتے ہوئے مرزا عابد حسین کی لائف آئیڈیل ہے۔ جو مصائب مرزا عابد حسین کو اپنی زندگی میں پیش آئے وہ بہت عجیب و غریب نہیں ہیں لیکن جن تدابیر سے انہوں نے ان بلاؤں کا مقابلہ کر کے ان کو دفع کیا، ان کے عمل میں لانے کی جرأت ابھی ملک میں بہت کم پیدا ہوئی ہے۔[۱۶]

مثالی انسان کا کردار تخلیق کرتے ہوئے رسوا کے پیش نظر دراصل ان کا اپنا مخصوص نظریہ حیات تھا۔ اس کے علاوہ اہل لکھنو کی خراب معاشی حالت اور تہذیبی بحران بھی اس کردار کی تشکیل میں معاون ہیں۔ وہ ان حالات اور سماجی روش پر اصلاحی نقطہ نظر سے نکتہ چینی کرتے ہیں۔ بقول ڈاکٹر ظہیر فتح پوری:

> رسوا سرسید تحریک سے عملی طور پر کبھی وابستہ نہ ہوئے لیکن ذہنی طور پر وہ اس سے بہت لگاؤ رکھتے تھے۔ اس ناول کے ہیرو (عابد حسین) کے تصورات اور سرسید کے تصورات میں بڑی مماثلت پائی جاتی ہے۔ ناول کا مقصد غیر مفید قدیم سماجی عوامل سے ناتہ توڑ کر جذبہ عمل کو اُبھارنے کی ترغیب دینا ہے وہ مذہب کو عقل کی کسوٹی پر پرکھتے ہیں مولویوں کو وہ سماج کے کاہل نکمے فرد سمجھتے ہیں۔۔۔ اپنے لڑکوں کو حصول تعلیم کے لیے علی گڑھ بھیجتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ انگریز حکومت دور اندیش ہے کہ تعلیم کی سہولتیں مہیا کر رہی ہے۔[۱۸]

رسوا کا تہذیبی شعور واضح ہے۔ ان کا ذہن سائنسی اقدار کا حامل ہے اس لیے وہ جدید علوم کی اہمیت سے آگاہ ہیں۔ مرزا رسوا انسان کو نیکی یا بدی کا مجسمہ نہیں سمجھتے بلکہ وہ حالات کو انسان کے رویوں کا ذمہ دار قرار دیتے ہیں۔ ان کے ناولوں کا موضوع دیگر اعلیٰ طبقات کے ساتھ متوسط طبقہ بھی ہے اور یہی وہ طبقہ ہے جو رسوا کے عہد میں سب سے زیادہ متاثر بھی ہوا تھا۔ بطور مجموعی مرزا رسوا نے لکھنوی معاشرت کے تمام گوشوں کو موضوع بنایا ہے۔ ''شریف زادہ'' میں تہذیبی زبوں حالی اور فرسودہ اقدار کو پیش کرنے کے ساتھ امید کی جوت جگانے کی بھی سعی کی ہے۔ اس مقصد کے لیے ناول میں ایک ایسا کردار تخلیق کیا ہے جو ہر طرح کے نامساعد حالات کا سامنا کرتا ہے اور محنت کے بل بوتے پر اپنی زندگی خوشگوار بنانے کی سعی کرتا ہے۔ ناول کے موضوع پر تبصرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر توحید خاں لکھتے ہیں:

رسوا نے اس ناول میں اس معاشرت کی عکاسی کی ہے جو ۱۸۵۷ء کے ناکام انقلاب کے بعد سماجی اور معاشی زبوں حالی کا شکار ہو چکی تھی۔ شاہی شان و شوکت ختم ہو چکی تھی، رقص و سرود کی محفلیں اجڑ چکی تھیں۔ عوام کے حوصلے پست اور دل مایوس تھے۔ لیکن ماضی کا نشہ اب بھی ذہن پر چھایا ہوا تھا۔ جدوجہد اور محنت و مشقت کو معیوب سمجھا جاتا تھا۔ گویا رسی جل گئی تھی لیکن بل باقی تھا۔[۱۹]

عابد حسین کا کردار رسوا کا مثالی کردار ہے۔ گو کہ یہ بھی رسوا کا کمزور ناول ہے لیکن یہ اس حوالے سے اہمیت رکھتا ہے کہ اس ناول میں رسوا نے سماجی تغیرات کے بدلتے ہوئے عمل میں نوجوانوں کو بھی بدلنے اور جدید دنیا کا ساتھ دینے کا درس دیا ہے۔ رسوا لکھنوی تہذیب کے پروردہ تھے۔ وہ اس تہذیب کو پسند بھی کرتے تھے اس لیے تہذیبی و معاشرتی مرقع کشی کرتے ہوئے رسوا زیادہ بہتر سماجی و تہذیبی شعور کا مظاہرہ کرتے ہیں۔

نذیر احمد کے ناولوں میں اصلاح پسندی اور سنجیدگی کا غلبہ ہے۔ عقلیت پسندی کا گہرا احساس ہے۔ ان کی اصلاح پسندی مثالیت پسندی کی حد تک موجود ہے۔ جبکہ سرشار تہذیبی مثالیت پسندی کے ساتھ جاتے ہیں۔ ''فسانہ آزاد'' میں لکھنو کی زندہ متحرک تصویریں نظر آتی ہیں۔ مرزا رسوا لکھنوی معاشرت کی عکاسی میں زیادہ پختہ فنی شعور کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ سرشار محض تہذیب کی پسندیدگی تک محدود رہتے ہیں جبکہ مرزا رسوا نہ تو سیاسی معاملات میں دخل دیتے ہیں اور نہ مصلح بننا چاہتے ہیں۔ بلکہ وہ فن کار پہلے ہیں اور سماجی شعور کا اظہار اپنے فنکارانہ شعور کے تابع رکھتے ہیں۔

حوالہ جات

۱۔ عبدالسلام، ڈاکٹر، فن ناول نگاری، اردو اکیڈمی سندھ، کراچی، طبع اول، ۱۹۹۹ء، ص ۱۵

۲۔ شمس الرحمٰن فاروقی، ساحری، شاہی، صاحب قرانی داستان امیر حمزہ کا مطالعہ، جلد اول: نظری مباحث، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی، طبع اول، ۱۹۹۹ء، ص ۳۲۶، ۳۲۷

۳۔ ہادی رسوا، مرزا، افشائے راز (دیباچہ)، نگارستان پریس لکھنو، س ن، ص ۱۳

۴۔ خورشید الاسلام، ڈاکٹر، تنقیدیں، انجمن ترقی اردو ہند، علی گڑھ، طبع دوم، ۱۹۶۴ء، ص ۱۱۹

۵۔ صدیقی، عظیم الشان، اردو ناول، آغاز و ارتقا (۱۸۵۷ء تا ۱۹۱۴ء)، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، اشاعت اول، ۲۰۰۸ء، ص ۴۱۷

۶۔ صغیر احمد صدیقی، مرزا رسوا کا شاہکار، مشمولہ: رسوا ایک مطالعہ، مرتب، میمونہ انصاری، ڈاکٹر، مکتبہ میری لائبریری، لاہور، ۱۹۸۸ء، ص ۱۶۵

۷۔ ہادی رسوا، مرزا، امراؤ جان ادا، مشمولہ: مجموعہ ہادی رسوا، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۰ء، ص

۸۔ یوسف سرمست، ڈاکٹر، بیسویں صدی میں اردو ناول، ترقی اردو بیورو، نئی دہلی، ۱۹۹۵ء، ص ۹۶

۹۔ عبدالسلام، ڈاکٹر، اردو ناول بیسویں صدی میں، اردو اکادمی سندھ، کراچی، ۱۹۷۳ء، ص ۱۳۱، ۱۳۲

۱۰۔ سہیل بخاری، ڈاکٹر، ناول نگاری۔ اردو ناول کی تاریخ و تنقید، مکتبہ میری لائبریری، لاہور، پہلی بار، ۱۹۶۶ء، ص ۱۵۵

۱۱۔ ہادی رسوا، مرزا، امراؤ جان ادا، مشمولہ: مجموعہ ہادی رسوا، ص ۹۷

۱۲۔ خورشید الاسلام، ڈاکٹر، تنقیدیں، انجمن ترقی اردو ہند، علی گڑھ، طبع دوم، ۱۹۶۴ء، ص ۱۵۷، ۱۵۸

۱۳۔ ظہیر فتح پوری، ڈاکٹر، رسوا کی ناول نگاری، حروف، راولپنڈی، طبع اول، ۱۹۷۱ء، ص ۹۱

۱۴۔ صدیقی، عظیم الشان، اردو ناول۔ آغاز و ارتقا، ص ۴۲۵

۱۵۔ خورشید الاسلام، ڈاکٹر، تنقیدیں، ص ۲۰۳

۱۶۔ توحید خان، ڈاکٹر، مرزا رسوا کے ناولوں کے نسوانی کردار، تخلیق کار پبلشرز، دہلی (انڈیا)، ۱۹۹۵ء، ص ۸۰

۱۷۔ مرزا ہادی رسوا، شریف زادہ، مشمولہ: مجموعہ مرزا ہادی رسوا، ص ۵۱۹

۱۸۔ ظہیر فتح پوری، ڈاکٹر، رسوا کی ناول نگاری، حروف، راولپنڈی، طبع اول، ۱۹۷۱ء، ص ۲۸۳، ۲۸۴

۱۹۔ توحید خان، ڈاکٹر، مرزا رسوا کے ناولوں کے نسوانی کردار، ص ۹۷